مجید امجد شناسی کا ایک اہم حوالہ ''کون دیس گئیو''از ناصر شہزاد کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

ناصر محمود[1]

Abstract:

Majeed Amjad is one of the most important poets of modern Urdu poetry. Especially in the tradition of Urdu Nazm, he is considered as a trend setter poet. He was born in Jhang on 29 June 1914 and died in Sahiwal on 11 May 1974. Although he was from Jhung but he spent the last 30 years of his life in Sahiwal. During his stay, he was an integral part of Sahiwal's literary circle and he also played an important role in strengthening the literary tradition of Sahiwal. He had a wide circle of literary friends in Sahiwal, of which Nasir Shahzad was the closest. Nasir Shahzad has written his long relationship with Majeed Amjad in book form, whose name is Kon Das Geyo. (کون دیس گئیو). This is one of the most important books for understanding the poetry and personality of Majeed Amjad and this book is considered as the primary reference. In addition, this book is also an important reference for understanding Nasir Shahzad himself, especially his unique style of writing. In this article, the scholar has provided important research information about Majeed Amjad and Nasir Shahzad himself through Nasir Shahzad's book.

Keywords: **Majeed Amjad, Urdu Poetry, Jhung, Sahiwal, Nasir Shehzad, Text, Critic.**

کلیدی الفاظ: مجید امجد شناسی، اردو شاعری، جھنگ، ساہی وال، ناصر شہزاد، کون دیس گئیو، متن، ابہام، اغلاط، تنقید، تصحیح متن، تدوین

''کون دیس گئیو''، تین سو چوالیس صفحات پر مشتمل ہے جو صفدر حسین کی تزئین واہتمام کے ساتھ الحمد پبلی کیشنز، لاہور نے اپریل ۲۰۰۵ء کو شائع کی۔ اس کا انتساب ناصر شہزاد نے مجید امجد شناسوں، ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے نام معنون کیا ہے۔ کیوں کہ ناصر شہزاد کے بقول، اُنھی کے پیہم کام نے اُنھیں یہ

1 پی ایچ۔ڈی اسکالر، شعبہ اردو، سرگودھا یونی ورسٹی

کام لکھنے کے لیے مدبر کیا۔(۱) یہ کتاب ناصر شہزاد کی مجید امجد سے دائمی محبت کا والہانہ اظہار ہے۔ محبت وعقیدت کا یہ سلسلہ مرتے دم تک رہا۔ ناصر شہزاد اِس دائمی محبت کا اعتراف اِن الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''کون دیس گئیو'' مجید امجد سے متعلق ہے جو اُنھی کے ایک مصرع سے محیط ہے کہ
> مجید امجد آج بھی مری روح کے اندر اسی طرح سے بسیط ہیں جیسا کہ وہ اپنی زندگی میں
> ورجیت تھے۔''(۲)

''کون دیس گئیو'' کو محض سوانحی یا تنقیدی کتاب تک محدود نہیں کیا جاسکتا۔ کیوں کہ یہ کتاب بیک وقت تحقیقی، تنقیدی اور سوانحی تاثرات کا بہترین امتزاج ہے۔ کیوں کہ یہ کئی تحقیقی حوالوں سے معاون ہے۔ یہ الگ بات کہ اس میں کوئی باقاعدہ اور باضابطہ تحقیقی یا تنقیدی انداز اختیار نہیں کیا گیا۔ اس کا اعتراف ناصر شہزاد نے خود بھی اِن الفاظ میں کیا ہے۔

> ''میں نہ ہی کوئی محقق ہوں اور نہ ہی کوئی نقاد۔ میں نے مجید امجد سے متعلق جو کچھ لکھا ہے
> صرف ان سے اپنی ذات کی بنا پر لکھا ہے اور اپنی پوری ادبی ذمہ داری کے ساتھ۔''(۳)

یہ کتاب ایک روانی کے ساتھ لکھ دی گئی ہے۔ جوں جوں یادوں کے دَر وا ہوتے ہیں۔ یادداشتی بیان قلم سے رقم ہوتے چلے گئے ہیں اور اپنی ذات کے علاوہ کسی دیگر حوالے یا ثبوت کا سہارا نہیں لیا گیا۔ بات جس جس ترتیب سے یاد آئی، وہ لکھتے چلے گئے ہیں۔ اس لیے اس کتاب میں واقعات غیر مربوط اور بے ترتیب شکل میں موجود ہیں۔ ایک واقعے سے دُوسرا اور دُوسرے سے تیسرا واقعہ جنم لیتا ہے اور پھر مصنف پہلی بات پر یہ کہتے ہوئے واپس آجاتا ہے کہ بات کہاں سے کہاں چلی گئی تو قاری ذہنی طور پر اُلجھ جاتا ہے۔ ایسا کتاب میں متعدد مقامات پر ہوا ہے۔ مثلاً کتاب کے ص ۱۱۳ پر شیر محمد شعری کا تذکرہ آیا ہے تو ان کا ایک واقعہ سنا کر پھر مجید امجد کی سوانح پہ بات شروع کر دی گئی اور ص ۱۱۵ پر پھر اچانک شیر محمد شعری کا تذکرہ ان الفاظ سے شروع کیا ہے:

> ''ہاں تو اُوپر ذکر تھا۔ شیر محمد شعری کا''(۴)

کتاب پڑھتے وقت اس بے ترتیبی سے واقعات ذہن میں گڈ مڈ ہو جاتے ہیں۔ کتاب کے مزید جائزے سے کئی لغزشیں سامنے آتی ہیں جو ناصر شہزاد سے دورانِ تحریر سرزد ہوئی ہیں۔ ان کا ازالہ ضروری ہے۔

مجید امجد کی مے نوشی کے بارے میں ناصر شہزاد رقمطراز ہیں:

''گاڑی آنے پر یہ سارے کا سارا قافلہ اس میں بیٹھ کر مصطفی زیدی کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ ہمارے وہاں پہنچنے پر زیدی صاحب نے جام و مینا منگوائے اور ایک ایک جام سب کے سامنے رکھ دیا گیا۔ مجید امجد نے مے نوشی سے معذرت چاہی مگر مصطفی زیدی نے اپنے محبت سے معمور اصرار میں مجید امجد سے کہا کہ امجد صاحب یہ وائٹ ہاؤس ہے۔ آپ یہ نہ پیئں، یہ کچھ سخت ہوتی ہے۔ میں آپ کے لیے شیمپیئن منگواتا ہوں۔ چناں چہ ایسا ہی کیا گیا۔''(۵)

جب کہ اگلے صفحے پر تردیدی بیان بھی آگیا، لکھتے ہیں:

''شراب پینے کی بات چلی ہے تو یہاں یہ بھی سن لیں کہ میں نے مجید امجد کے ساتھ اپنی پوری مسافت یا رفاقت کے ایام میں مجید امجد کو شراب پیتے ہوئے نہیں دیکھا۔''(۶)

پہلے بیان میں مے نوشی کے متعلق معاملہ واضح نہیں کیا گیا۔ کیوں کہ مصطفی زیدی کے اصرار پر شمپیئن منگوا تو لی گئی لیکن آگے پینے یا نہ پینے سے متعلق کوئی وضاحت موجود نہیں اور نہ ہی یہ تردید کی گئی ہے کہ مجید امجد نے مصطفی زیدی کو منع کیا ہو یا انکار کیا ہو۔ ظاہری طور پر یہی لگتا ہے کہ مجید امجد مصطفی زیدی کو ٹال نہیں سکے اور ناصر شہزاد نے اپنی گہری اور اندھی عقیدت کے سبب اس بیان سے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا ہے جس کی بنا پر اُن کا دوسرا بیان مشکوک ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد اسلم ضیاء کے خیال میں بھی ناصر شہزاد نے اس معاملے کی کھل کر وضاحت اس لیے نہیں کی کیوں کہ وہ محبت عقیدت میں ناصر شہزاد کو ولی کا درجہ دیتے ہیں لہٰذا مشرقی آداب کے مطابق اُنھوں نے ان کا پردہ رکھنے کی کوشش کی ہے۔(۷) ڈاکٹر نوازش علی اس ضمن میں رقمطراز ہیں:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ مجید امجد ایک زمانے میں کبھی کبھار شراب پی لیا کرتے تھے اور پھر ۱۹۵۱ء یا ۱۹۵۴ء کے بعد اُنھوں نے شراب نوشی بالکل ترک کر دی تھی۔''(۸)

اِن حوالوں سے ظاہری نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ مجید امجد اوائل عمر میں بطور خاص جھنگ قیام کے دوران شراب پیتے رہے، بعد میں ترک کردی لیکن یہ کافر منہ کی لگی ہوئی اتنی جلدی جانے والی نہیں تھی کہ دوستوں کے اصرار پر بھی یہ پابندی قائم رہتی۔ آثار یہی لگتے ہیں کہ اصرار پر وہ دوستوں کا کہا ٹال نہیں پاتے تھے۔

مجید امجد کے سگریٹ ترک کرنے کے واقعہ کو بھی ناصر شہزاد نے خود سے منسوب کیا ہے کہ ان کے سامنے مجید امجد نے سگریٹ ترک کرنے کا فیصلہ کیا۔ جس کے بعد کے اثرات بھی ان کے سامنے رہے یعنی مجید امجد کی طبیعت بوجھل رہنے لگی اور اس بابت ڈاکٹر وزیر آغا کے استفسار پر ناصر شہزاد نے اُنھیں سگریٹ چھوڑنے کی بابت آگاہ بھی کیا(۹) جو اس بوجھل پن کا سبب تھی۔ جب کہ مجید امجد کے قریبی رفیق جعفر شیرازی دعویدار ہیں کہ مجید امجد نے سگریٹ سے نجات ان کی ترغیب کی بدولت پائی۔ ایسی توبہ کی کہ ساری زندگی اس سے دُور رہے(۱۰) اور ڈاکٹر محمد امین کے بقول مجید امجد اور مراتب اختر نے اکٹھے سگریٹ نوشی ترک کرنے کا فیصلہ کیا اور مجید امجد اس فیصلے پر مرتے دم تک قائم رہے۔(۱۱)

درج بالا تینوں آراء میں تضاد پایا جاتا ہے لیکن ناصر شہزاد کی رائے حقیقت کے قریب لگتی ہے کیوں کہ اُنھوں نے سگریٹ ترک کرنے کے بعد مجید امجد کی طبیعت کے جس بوجھل پن کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس سے ہر پیشہ ور سگریٹ پینے والا آدمی، سگریٹ کے اچانک چھوٹ جانے سے گزرتا ہے۔ یہ طبعی اضمحلال ناصر شہزاد کی رائے کو تقویت بخشتا ہے۔ مجید امجد کی نظم ''پنواڑی'' کے مرکزی کردار سے متعلق بھی کئی قیاس آرائیاں موجود ہیں، ناصر شہزاد لکھتے ہیں:

> ''نظم ''پنواڑی'' اور ''کنواں'' کی بات ہوئی ہے تو یہ بھی سن لیں کہ ان نظموں کے پس منظر میں کیا ہے۔ پنواڑی کا نام دیارام تھا۔ لمبی لمبی جٹاؤں والا۔ دراز قد۔ جوگیا کپڑوں میں ملبوس پاؤں میں کھڑاؤں اور ماتھے پر تلک۔ جنگ کے طوائف کدہ۔ (چکلہ) میں پان لگایا کرتا تھا۔''(۱۲)

ڈاکٹر خورشید رضوی کے خیال کے مطابق یہ نظم منٹگمری کے ایک بوڑھے پان فروش پر لکھی گئی[۱۳] جب کہ شیر محمد شعری بھی پنواڑی کے کردار کی تصدیق کرتے ہیں کہ یہ فرضی نہیں بلکہ اصلی کردار ہے۔مزید اضافے کے طور پر اُنھوں نے لکھا ہے کہ وہ ہندو نوجوان آدمی تھا جس کی لمبی لمبی زلفیں اور پاؤں میں کھڑاؤں ہوتی تھیں۔اپنے پان کی شہرت کی بدولت وہ مجید امجد کی نظم کا موضوع بنا[۱۴]لیکن شیر محمد شعری نے پنواڑی کے مقام کا تعین نہیں کیا۔

ڈاکٹر خورشید رضوی کا بیان بعید از قیاس ہے کیوں کہ نظم ''پنواڑی'' ۸ فروری ۱۹۴۴ء کی تخلیق ہے۔[۱۵] یہ دور مجید امجد کے قیام جھنگ کا ہے۔ناصر شہزاد کے بیان سے اتفاق کیا جاسکتا ہے لیکن وہ جتنے وثوق کے ساتھ کہہ رہے ہیں۔اس کا جواز اُنھوں نے فراہم نہیں کیا، کیوں کہ مجید امجد سے ان کا تعلق ساہیوال قیام کے دوران استوار ہوا تھا، یوں ''پنواڑی'' کے کردار کے بارے میں ان کے پاس سنی سنائی یادداشتیں ہو سکتی ہیں۔خواہ وہ مجید امجد سے سنی ہوں یا کسی اور سے۔لیکن ان کا اس کردار کے حوالے سے بات کرنے کا انداز دیگر حوالوں سے حاصل شدہ معلومات والا نہیں لگتا۔

اُنھوں نے اس کردار کو ایسے بیان کیا ہے جیسے وہ اس کردار کے بارے میں قریبی معلومات سے اچھی طرح واقف ہیں۔اس کردار کے بارے میں کوئی دیگر مستند حوالہ موجود نہیں۔لیکن پھر بھی یہ نظم چوں کہ مجید امجد کے جھنگ قیام کی یادگار ہے۔اس لیے ناصر شہزاد کی رائے حقیقت کے قریب معلوم ہوتی ہے۔

ناصر شہزاد نے مجید امجد کی نظم ''کنواں'' کا مقام تخلیق گوجرہ کے ایک گاؤں کو قرار دیا جس میں وہ اپنے دوست تخت سنگھ سے ملنے جاتے اور وہیں موجود ایک ''کنواں'' اس نظم کی تخلیق کا سبب بنا۔[۱۶] ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے بھی اسی خیال کی تائید کی ہے کہ نظم ''کنواں''، تخت سنگھ کے گاؤں کی ہی یادگار ہے[۱۷] جب کہ اس حوالے سے سید جعفر شیرازی لکھتے ہیں:

> ''مجید امجد اور میں تقریباً ہر اتوار کو ٹوبہ ٹیک سنگھ کے پاس ایک ریلوے اسٹیشن پر اُتر جاتے۔نزدیک ہی ایک چھوٹا قصبہ تھا۔یہاں تخت سنگھ رہتا تھا۔۔۔۔تخت سنگھ کے گھر

کے سامنے دس پندرہ گز کے فاصلے پر رہٹ کی گول کا کنارہ تھا، جس پر دن بھر بیل چلتے رہتے تھے۔۔۔اتوار کا سارا دن ہم چار پائیاں ڈال کر اس منڈیر پر بیٹھے رہتے۔۔۔ کنواں چل رہا ہے۔اس عہد کی یادگار نظم ہے۔''(۱۸)

گمان غالب ہے کہ ناصر شہزاد اور ڈاکٹر ناصر عباس نیّر نے جعفر شیرازی کے اس بیان کو ہی کورٹ کیا ہے کیوں کہ ناصر شہزاد نے بھی مجید امجد کے جھنگ قیام کے زمانے کو سنی سنائی یادداشتوں کے سہارے ہی بیان کرنے کی کوشش ہے لیکن اُنھوں نے اس نظم کا سن تخلیق ۱۹۴۴ء درج کیا ہے(۱۹) جو درست نہیں کیوں کہ یہ نظم ۱۲ فروری ۱۹۴۱ء کی تخلیق ہے۔(۲۰) علاوہ ازیں درج بالا تحریر میں جعفر شیرازی نے تخت سنگھ سے اپنے جس والہانہ اور پر تکلف تعلق کا اظہار کیا ہے، مجید امجد تخت سنگھ کے بارے میں اپنے تحریر کردہ مضمون میں اس کی نفی کرتے نظر آتے ہیں کہ وہ ایک دفعہ تخت سنگھ کے گاؤں گئے لیکن پھر نہ جا سکے، البتہ ان سے رابطہ قائم رہا۔(۲۱) تخت سنگھ نے اپنے ایک خط میں مجید امجد سے حد درجہ بے تکلفی کا اظہار کرتے ہوئے یہ اقرار کیا ہے کہ مجید امجد کئی بار میرے پاس گاؤں آئے اور میں بھی کئی بار اُن کے ہاں گیا۔(۲۲) مجید امجد اور تخت سنگھ کی رائے میں کھلا تضاد ہے۔ جس کی ایک صورت یہ بھی ممکن ہو سکتی ہے کہ مجید امجد شاید ایک سے زیادہ یعنی دو تین دفعہ گئے ہوں لیکن بطور خاص گاؤں میں ہر اتوار یا بہت زیادہ جانا مجید امجد کی شخصیت کے مجموعی مزاج سے لگا نہیں کھاتا، ورنہ مجید امجد کبھی یہ نہ کہتے کہ میں ایک سے زیادہ بار تخت سنگھ کی طرف نہ جا سکا۔ مجید امجد نے تخت سنگھ کے بارے میں مضمون میں یہ بھی لکھا کہ آج سے بیس بائیس برس پہلے تخت سنگ کے ہاں گئے تھے۔(۲۳) یہ مضمون اگست ۱۹۶۴ء کا ہے۔اِس حساب سے یہ ۱۹۴۴ء یا اس سے ایک آدھ سال پہلے کی بات بنتی ہے جب کہ ''کنواں'' تو ۱۹۴۱ء میں تخلیق ہوئی۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نظم گوجرہ کے علاقے کی یادگار نہیں۔اس ضمن میں پروفیسر تقی الدین انجم کی درج ذیل رائے حقیقت کے زیادہ قریب نظر آتی ہے۔ جو اُنھوں نے نظم ''کنواں'' کے پس منظر کے بارے میں دی:

''چنداں والا (جھنگ صدر کے ایک محلے کا نام) سے آگے مجید امجد سیر کو جایا کرتے تھے۔
کنویں کی آواز، پانی کی روانی اُنھیں متاثر کرتی تھی۔ ان کا تخیل، جزو سے کل کی طرف پرواز
کرتا تھا۔ عام مناظر سے گہرے نتائج نکال کر خیال افروز بنا دیتے تھے۔''(۲۴)

یوں ڈاکٹر نوازش علی کے اِس بیان کو بھی تقویت ملتی ہے کہ ''یہ نظم جھنگ ہی کی ثقافتی فضا کی دین ہے۔''(۲۵) ویسے بھی ناصر شہزاد کے پاس اِس نظم کے پس منظر کی بابت کوئی مستند حوالہ موجود نہیں اور اُنھوں نے محض سنی سنائی باتوں کی روشنی میں قیاس سے کام لیا ہے۔ نظم ''کیلنڈر کی تصویر'' کے پس منظر کے تذکرے میں ناصر شہزاد لکھتے ہیں کہ:

''کیلنڈر کی تصویر'' مجید امجد نے صبیحہ خانم کی ایک تصویر دیکھ کر کہی تھی۔ غالباً یہ ۱۹۵۹ء کے اوائل کا واقعہ ہے۔ میں اور مجید امجد شام کے سمے سٹیڈیم ہوٹل میں حسبِ معمول جا کر بیٹھے، امجد صاحب جس کرسی پر براجمان ہوئے۔ اس کا رُخ سٹیڈیم ہوٹل کی مغربی دیوار کی طرف تھا۔ وہاں نئے سال کا کیلنڈر لٹکا ہوا تھا، جس پر فلم سٹار صبیحہ خانم کی ایک نہایت ہی خوش آمیز اور جلوہ خیز تصویر تھی۔ مجید امجد نے اسے دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے۔ انہماک اتنا تھا کہ ہاتھ لرزا اور پیالی ہاتھ سے میز پر گر گئی جس سے گری ہوئی چائے، سٹیڈیم ہوٹل کے بیرا طفیل نے ڈسٹر سے صاف کر دی۔ امجد صاحب پہلے جھینپے، پھر سوری کہا اور پھر خاموش ہو گئے۔۔۔۔۔ دُوسرے دن اسی ٹیبل پر اس وقت مجھے مجید امجد نے ایک نظم سنائی، جس کا عنوان ''کیلنڈر کی تصویر'' تھا۔''(۲۶)

ڈاکٹر نوازش علی نے اس حوالے سے کچھ اعتراضات قلمبند کیے ہیں۔ پہلا اعتراض یہ ہے کہ:

''نظم کی تاریخ تصنیف کے حوالے سے ناصر شہزاد کو تسامح ہوا ہے کہ ''غالباً ۱۹۵۹ء کے اوائل کا واقعہ ہے۔'' ویسے بھی اُنھوں نے ''غالباً'' لکھا ہے تاہم کلیاتِ مجید امجد کے مطابق یہ نظم ۱۹۵۹ء کے آخر میں تخلیق ہوئی۔''(۲۷)

سوال یہ ہے کہ ایک تو ناصر شہزاد نے ''غالباً'' کا لفظ ادا کیا تو اس کا مطلب یہی نکلتا ہے کہ بات اندازے سے کی گئی ہے اور دوسرا یہ کہ اگر اُنھوں نے اس کی تصحیح کے لیے ''کلیاتِ مجید امجد'' کو ہی بنیاد بنایا ہے تو

اس کے صرف پہلے ایڈیشن کو ہی مد نظر رکھا ہے اور بعد میں چھپنے والے ۲۰۰۳ء، ۲۰۰۶ء اور ۲۰۱۰ء کے (طبع نو) کے ایڈیشنوں پر نظر نہیں ڈالی جن پر محض ۱۹۵۹ء درج ہے اور ظاہر ہے یہ تازہ معلومات ہے جس کی روشنی میں اس نظم کے ۱۹۵۹ء کے اواخر میں ظہور پذیر ہونے کی دلیل کا کوئی جواز نہیں بنتا۔

اس نظم کے پس منظر کے بارے میں ناصر شہزاد کی رائے سے آگہی اور اس کے متن کے بغور جائزے کے بعد ڈاکٹر نوازش علی کا دوسرا اعتراض یہ ہے:

> ''کیلنڈر پر یقیناً تصویر تو صبیحہ کی تھی لیکن صبیحہ کی تصویر دیکھ کر ہاتھ سے پیالی نہیں گری بلکہ مشابہت اس قدر زیادہ تھی کہ وہ اسے شالاط کی تصویر سمجھ بیٹھے اور حیرت کے باعث پیالی ہاتھ سے گر گئی۔''(۲۸)

اس معاملے کو بہتر طور پر سمجھنے کی لیے نظم کا متن ملاحظہ کریں:

اچانک جو ہوٹل کی دیوار کے
اک اونچے دریچے میں لٹکی ہوئی
شبیہ حسین پر نظر جا رکی
پیالی مرے ہاتھ سے گر پڑی!
کہا دل سے میں نے
کہ ''اے خوش خرد
نگاریں ہے جس سے ترے غم کا ظرف
وہ خط جبیں، وہ خال مبیں،
نہیں۔۔۔۔یہ نہیں،
زبان پر نہ لا نام شیریں کے حرف
کہاں تیرے شعلے کہاں شہر برف''
میں اس سوچ میں تھا کہ دیوارِ دل
پر اک عکس اُبھرا مرے روبرو

وہی وضعِ رُو، وہی قطعِ مو،
وہی ہو بہو،
خرابات ایام میں چار سُو،
کھنکنے لگے طاقچوں پر سُبو

(کلیات مجید امجد، ص ۳۴۶:۳۴۷)

نظم کے پہلے بند کے چار مصرعے ناصر شہزاد کے بیان کی مکمل تائید کرتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ نظم اسی تصویر کے نظارے کے بعد وجود میں آئی اور اس سے آگے ناصر شہزاد نے نہ اس کے متن پر تنقید کی ہے اور نہ اس نظم کے باطن میں اترے ہیں۔ اُنھوں نے محض یہ معلومات فراہم کی ہے کہ یہ نظم کس موقع پر کس حوالے سے وقوع پذیر ہوئی۔ مزید برآں اپنی اس کتاب میں آگے چل کر اُنھوں نے خود اعتراف کیا ہے کہ اس نظم کی آخری سطروں میں شالاط کا عکس ملتا ہے۔ اِن صفحات پر ڈاکٹر نوازش علی کی نظر نہیں گئی، ورنہ وہ اِس رائے سے گریز کرتے۔ کیوں کہ ناصر شہزاد نے واشگاف الفاظ میں نظم ''کیلنڈر کی تصویر'' کے بارے میں لکھا:

''یہ نظم کہ اس کا ذکر پہلے بھی کہیں کتاب کی ابتداء میں ہو چکا ہے۔ اسے مجید امجد نے فلمسٹار صبیحہ خانم کی تصویر کو دیکھ کر لکھا، مگر اس نظم میں بھی مجید امجد نے شالاط کے سراپا حسن ہی کو واردات کیا ہے۔''(۲۹)

ایک بات اور بھی ہے کہ مجید امجد کے ہاتھ سے پیالی گری۔ فوراً گری تو یہ اسی تصویر کی ظاہری دلکشی تھی۔ یہ الگ بات کہ تصویر کے بغور جائزے کے بعد اُنھوں نے اس خوب صورت سراپے کو اس سراپے پر منطبق کیا جسے اُنھوں نے دل کی گہرائیوں میں چھپا رکھا تھا اور یہ یقیناً شالاط ہی تھی۔ کیوں کہ اسی نظم کے آخری بند کے مصرعوں میں بات کافی حد تک کھل جاتی ہے اور یہ نظم کے آخری مصرعے قابل غور ہیں۔ مصرعے ملاحظہ کریں:

میں اس سوچ میں تھا کہ دیوارِ دل پر اِک عکس اُبھرا مرے روبرو
وہی وضعِ رُو،

وہی قطع مو،

وہی ہو بہو،

یعنی پہلے پیالی ہاتھ سے گر چکی تھی اور پھر تصویر کے بھرپور سراپے کے جائزے کے بعد اُنھیں اپنے دیوارِ دل پر ابھرنے والے ایسے ہی خوب صورت عکس کی مشابہت کا احساس ہوا اور یہ احساس ایسے ہی تھا جیسے کسی خوب صورت چہرے کو دیکھنے کے بعد انسان کو اپنے محبوب کی یاد آجاتی ہے۔

ڈاکٹر محمد اسلم ضیاء نے ''کون دیس گیئو'' کے حوالے سے درج ذیل نکتے اٹھائے ہیں:

(i) ''ناصر شہزاد نے شالاط کی آمد و رخصت کا دوٹوک تعین نہیں کیا۔آغا صاحب کی کتاب پہلے آچکی تھی۔آغا صاحب نے جو سنین دیے ہیں اس کے بارے میں کوئی رائے نہیں دی، حالاں کہ وہ چشم دید گواہ تھے۔''(۳۰)

(ii) ''شالاط کی واپسی کے بعد، مجید امجد کا ردعمل کیا تھا۔اس بارے میں بھی ناصر شہزاد نے واضح طور پر نہیں لکھا۔''(۳۱)

(iii) ''مصنف اشعار کا تجزیہ نہیں کرتے، تاثراتی جملے لکھ دیتے ہیں۔''(۳۲)

راقم کے خیال میں کتاب کی مکمل ورق گردانی، اس کی وجہ تحریر و تاخیر کے بارے میں ناصر شہزاد کے بیان کو پڑھنے کے بعد ایسی آراء کی ضرورت قطعاً نہیں تھی، کیوں کہ ناصر شہزاد بنیادی طور پر تحقیقی آدمی نہیں تھے اور نہ ہی اُنھوں نے اس کتاب کو تحقیقی اور مکمل طور پر تنقیدی بنیادوں پر لکھا ہے۔ وہ کتاب کے آغاز میں اس بات کی وضاحت بھی کر چکے ہیں۔ وہ لکھنے بیٹھے ہیں تو بس یادوں کے بہاؤ میں بہتے چلے گئے ہیں۔ شالاط کی آمد، رخصت کی کئی دہائیوں کے بعد جب وہ لکھنے بیٹھے تو ظاہر ہے کہ شالاط کی رخصت کے حوالے سے تو ڈاکٹر وزیر آغا نے آگاہ کر دیا تھا لیکن اس کی آمد کے بارے میں کوئی تحریری حوالہ موجود نہیں۔ اگر کوئی ہوتا تو اب تک ضرور سامنے آچکا ہوتا۔اس لیے شالاط کی آمد کا تعین اگر محققین کی نظر سے بھی نہاں رہا تو محض یادداشت کے سہارے ناصر شہزاد کے لیے بھی ممکن نہیں تھا اور نہ ہی شالاط کی موجودگی کے دور میں اس کی کوئی ضرورت تھی اور نہ ہی کسی کا خیال اس جانب گیا ہوگا۔ البتہ کوئی تحریری حوالہ یا دستاویز اس مسئلے کو سہل بنا سکتی تھی جو دستیاب نہیں۔ اسی لیے ناصر شہزاد بھی سنین کے حوالے سے ناواقف نظر آتے ہیں۔ جہاں تک شالاط کی واپسی کے بعد مجید امجد کے ردعمل کے بارے میں ناصر شہزاد کی خاموشی کی بات ہے۔ تو مجید امجد پر ان کی سوانح، شخصیت کے حوالے

سے چند مضامین موجود ہیں۔ ہر مضمون میں ان کی سوانح، شخصیت کے حوالے سے ایک، دو واقعات کا بیان ہے، جب کہ ان کی سوانح و شخصیت کے حوالے سے سیکڑوں باتوں اور واقعات کا بیان اس کتاب میں ہوا ہے۔ ایسی صورت میں ایک آدھ حوالے کا نہ ہونا اچنبھے کی بات نہیں۔ ویسے بھی ناصر شہزاد ایک تو مجید امجد کا بے حد احترام کرتے تھے اور دُوسرا مجید امجد دل کی باتیں دوسروں کو بتانے کے معاملہ میں حد درجہ محتاط تھے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر وزیر آغا یا دوسرے احباب نے بھی زیادہ تر حوالے ان کی اس دور کی نظموں سے کشید کیے ہیں۔

اسی طرح مجید امجد کے اشعار کے تجزیے کا عمل بھی اتنا سہل نہیں تھا۔ مجید امجد کا ایک شعر بسا اوقات ایک مضمون کا متقاضی ہوتا ہے۔ اس لیے ایک کتاب میں مجید امجد کی سوانح و شخصیت اور اشعار کا کلی تجزیہ ممکن نہیں تھا لیکن اس کا یہ قطعی مطلب نہیں کہ اُنھوں نے اس معاملے میں مکمل بے اعتنائی برتی ہے۔ کتنے اشعار ہیں جن کا تجزیہ کتاب میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ البتہ کسی بھی شاعر کی شاعری کے ہر شعر کا کلی تجزیہ ناممکنات میں سے ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ کتاب کافی حد تک تاثراتی ہے جس کی وجہ سے تاثراتی جملوں کا در آنا فطری اَمر ہے۔

کتاب میں کئی واقعات کو ناصر شہزاد نے اپنے قیاس سے خود سے جوڑنے کی کوشش بھی کی ہے۔ مثلاً مجید امجد کی ایک نئی غزل کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''جوں جُوں وہ غزل آگے بڑھی ہم شعری نشہ سے نہال ہو گئے۔ جب امجد اس شعر پر پہنچے، پکارتی رہی بنسی بھٹک گئے ریوڑ۔ نئے گیاہ، نئے چشمہ رواں کے لیے۔ تو میں چونکا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ مجید امجد نے میرے لیے کہا ہے کہ میں ان دنوں شاعری سے ذرا الگ تھلگ ہو کر اپنے گاؤں کی طرف مراجعت کر گیا تھا۔''(۴۳)

یہاں بھی ناصر شہزاد نے مجید امجد سے خود کو جوڑا ہے۔ حالاں کہ شاعر کا شعر اپنے دامن میں کئی مفاہیم لیے ہوتا ہے اور پھر شعر کے متن میں بھی کوئی واضح اشارہ نہیں ملتا لیکن اس کے باوجود اُنھوں نے اس شعر کو خود سے منسوب کرنے کی کوشش کی ہے اور ایسا کتاب میں کئی مقامات پر کئی واقعات کے بیاں میں ہوا ہے

لیکن کتاب میں اپنی شاعری سے متعلق مجید امجد کی اصلاح اور ان کے کافی کلام کی اپنے کلام میں شمولیت کا برملا اعتراف کر کے ناصر شہزاد نے اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا ہے۔ اُنھوں نے نہ صرف مجید امجد سے لی گئی شعری تربیت کا برملا اعتراف کیا ہے بلکہ مجید امجد نے اگر ان کی کسی غزل کی اصلاح میں ایک شعر کا بھی اضافہ کیا تو اس کی نشان دہی اُنھوں نے بلا جھجک کر دی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

''میں ناصر شہزاد کی عظمت کو سلام پیش کرتا ہوں کہ اُنھوں نے اپنے نام اور مقام کو اس کتاب میں کہیں بھی سربلند کرنے کی کوشش نہیں کی۔''(۴۴)

ناصر شہزاد نے کتاب لکھتے وقت کئی باتوں اور واقعات کو دہرایا ہے۔ مثلاً مجید امجد سے سب دوستوں کا فیض اُٹھانا، موت پر مجید امجد کی نظمیں، بچھڑے لوگوں کی یاد کا حوالہ، عصا والے شعر، مصنف کے لاٹھی دینے کا واقعہ، کیلنڈر کی تصویر کا واقعہ، نظم ''دنوں کے آشوب'' پر بات، پنکھڑی اور پکھڑی کے فرق والا معاملہ، مجید امجد کی بینائی سے متعلق بات، نظم ''ایکسیڈنٹ'' کا حوالہ، فیض اور امجد کی غزل کا حوالہ، امجد کی وفات کے بعد کا منظر، یہ باتیں دُہرائی گئی ہیں اور سائیکل کی چوری والے واقعے کے دہرائے جانے کا اعتراف تو ناصر شہزاد نے خود کیا ہے۔

کتاب میں کتابت کی بے شمار غلطیاں ہیں۔ کتابت کی اِن غلطیوں نے جہاں مذکورہ نظموں کے متن میں وقوع پذیر ہو کر ان کا مفہوم متاثر کیا ہے، وہاں واقعات کے بیان میں بھی گمراہی کے اندیشے نے جنم لیا ہے۔ یہ کتاب ناصر شہزاد کی زندگی میں اشاعت پذیر ہوئی۔ اس لیے اُنھیں کتابت کی ان غلطیوں کا ازالہ کرنا چاہیے تھا۔ مثلاً کتاب کے ص ۳۵ پر نظم ''کوئٹے تک'' کا مصرع اس طرح درج ہے۔

''پگ پگ شر ربرس گئے میں ڈھونڈتا پھرا''

اس مصرعے میں ''پگ پگ'' غلطی سے لکھ دیا گیا ہے۔ یہاں لفظ ''ہر سُو'' آنا چاہیے تھا۔

اسی طرح کتاب کے ص ۱۳۲ پر درج ہے:

''چہرہ مسعود ۱۹۶۵ء اور ہمارے وجود''۱۹۷۳ء میں لکھی گئی۔ بیچ میں ۱۸ برس کا فاصلہ ہے،اِن ۱۸ برسوں میں مجید امجد کی شاعری تیج اور تپسیا کی کتنی کٹھنائیوں اور کتنی رعنائیوں سے گزری۔''

جب کہ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۳ء کے درمیان وقفہ ۸ سال بنتا ہے اور ۸ کے ساتھ اضافی ایک کی وجہ سے غلطی سے ۱۸ برس درج کر دیا گیا ہے

اسی طرح کتابت کی چند غلطیاں درج ذیل ہیں:۔

مندرج لفظ	اصل لفظ	کتاب کا صفحہ نمبر
پیغراں	پیغمبراں	۱۲
گسیو واں	گیسواں	۱۲
میںؔ	میں	۵۰
راہگذ	راہگزر	۱۰۵
ودلیت	ودیعت	۱۲۸
ہنسی	ہنسی	۲۱۲
تدرد	تردّد	۲۵۰

اسی طرح اکثر مقامات پر الفاظ کے غلط اندراج نے متن کے مرتبے اور مقام کو متاثر کیا ہے۔

ناصر شہزاد نے اپنے اسلوب میں مترادف اور ہم آواز الفاظ سے شگفتگی پیدا کی ہے جس نے ان کی نثر کو جداگانہ شناخت کی حامل نثر بنا دیا ہے۔ بقول اظہار الحق:

''ان کی نثر بھی ایک الگ ہی شناخت لیے ہوئے ہے۔ ہم قافیہ الفاظ اس بے ساختگی سے آتے ہیں جیسے بادلوں کے پرے بندھے ہوئے ہوں۔ شوکت اور شکوہ دست بستہ کھڑے نظر آتے ہیں۔''(۳۵)

یہ اسلوب محض اِس کتاب کی حد تک نہیں بلکہ مجموعی طور پر ان کی نثر کا اسلوب ہے جو ان کے تحریر کردہ دیباچوں، خطوط اور مضامین میں بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے پس منظر میں گہرا شعور اور مطالعہ کار فرما ہے۔ ''زبان کے اس ساحرانہ اور ماہرانہ استعمال کا قرینہ، کثرت کے ساتھ لسانیات کے مطالعہ کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا۔''(۳۶) یہ دلکش اور سرل ڈکشن اسلوب کو شاعرانہ بنا دیتی ہے۔ جملے دیکھئے:

''اس آباد کاری اور سرشاری کا صلہ مجید امجد کے روحانی سمبندھ کی وِلا ہے، جس نے مجھے رنگ اور آہنگ کی فرہنگ سے تیج ترنگ کیا۔''(۳۷)

''آپ اپنی ہونی کے لمبے پھیروں میں پاپ اور شراپ سے نہیں گزر رہے بلکہ آپ کے سامنے آسمانوں سے گری ہوئی بانیوں کی تھاپ اور جہانوں میں جاگتی ہوئی کہانیوں کے جاپ ہیں۔''(۳۸)

''کون دیس گئیو'' میں ناصر شہزاد نے واقعات کے بیان کے ساتھ ساتھ مجید امجد کے شعری محاسن کو اپنے اچھوتے مسجّع و مقفّیٰ اسلوب کے ذریعے قاری تک پہنچانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ مجید امجد سے متعلق معلومات کا بیان ایک طرف لیکن منفرد اسلوب کی مٹھاس کا اپنا حسن ہے جو عبارت کی دلکشی اور قاری کی دلچسپی میں اضافے کا باعث ہے۔ ڈاکٹر شمس الرحمن فاروقی نے ''کون دیس گئیو'' میں ناصر شہزاد کی مجید امجد سے متعلق معلومات اور ناصر شہزاد کے شاعرانہ اسلوب کا اعتراف اِن الفاظ میں کیا ہے:

''پوری کتاب ایک طویل نظم کا حکم رکھتی ہے۔ مجید امجد شاعر، مجید امجد شاعروں کا شاعر، مجید امجد نو آموز شعراء کی ہمت افزائی کرنے اور ان کے کلام پر خاموشی سے اصلاح دینے والا شاعر، مجید امجد خود دار، غیور اور فیاض، کھلے ہاتھ کا شاعر، مجید امجد اپنی آگ میں جل بجھنے والا شاعر اور عاشق، کون سی بات ہے جو آپ نے نہیں بیان کی اور کون سی بات ہے جو آپ نے خوب صورتی سے بیان نہیں کی۔''(۳۹)

ڈاکٹر نوازش کے خیال میں ''یہ کتاب اپنے شعری اسلوب کی بنا پر ایک جداگانہ شان رکھتی ہے۔''(۴۰)لیکن کتاب میں کہیں کہیں ہندی ڈکشن کی زیادتی قاری کے لیے الجھن کا سبب بنتی ہے۔اردو دان طبقہ ان الفاظ سے زیادہ تر ناواقف ہوتا ہے۔مثال کے لیے جملے دیکھیے:

''مجید امجد کی متعدد نظمیں اسی کرم کانتا اور بھرم شانتا کی متلاشی دکھائی دیتی ہیں۔تلاش اور سدھ سبھاش سہانتا سے متعلق مجید امجد کی نظم ''جانے اگلی صورت پڑھیے۔''(۴۱)

''بھسمنت ہونے ہی سے بھاگ، بھاگیتر ہوتے ہیں اور منش کے بھتیر میں بھوگ اور بھجن کی مایا جاگتی ہے۔''(۴۲)

ڈاکٹر محمد اسلم ضیاء نے مجید امجد کی نثر کو نظر انداز کرنے کے حوالے سے اعتراض اٹھایا ہے،لکھتے ہیں:

''مجید امجد کو بطور نثر نگار، لائق اعتنا نہیں سمجھا۔''(۴۳)

اس اعتراض سے قبل ڈاکٹر محمد اسلم ضیاء کو کتاب کے نام کو پوری طرح پڑھنا چاہیے تھا۔کتاب کے مکمل نام ''کون دیس گئیو (مجید امجد کی حیات اور شعری کائنات)'' میں تخصیص کر دی گئی ہے کہ سوانح و شخصیت کے علاوہ صرف ان کی شاعری کا تذکرہ ہوگا۔

''کون دیس گئیو'' کے جائزے کے بعد مجموعی طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ کتاب میں واقعات کی ترتیب و تنظیم کو مد نظر نہیں رکھا گیا۔ مصنف کوئی واقعہ کہیں بیان کر دیتے ہیں اور کوئی کہیں جس سے کتاب میں بے ربطی اور بے ترتیبی کا احساس ہوتا ہے۔ پھر واقعات کی کوئی زمانی ترتیب بھی نہیں ہے۔اُنھوں نے جو واقعات بیان کیے ہیں۔ان میں بطور خاص ساہیوال کے واقعات آنکھوں دیکھے ہونے کی بنا پر اپنی جگہ حقیقت کا درجہ رکھتے ہیں، تاہم بہت سی باتیں یا مواد ایسا ہے جو کانوں سنی باتوں پر مشتمل ہے اور اس میں سے بیشتر مواد مجید امجد کے قیام جھنگ سے متعلق ہے جو ناصر شہزاد کی مجید امجد سے پہلی ملاقات سے پہلے کا دور ہے۔اس دور کے حوالے سے ناصر شہزاد کو کوئی حوالہ دینا چاہیے تھا کیوں کہ وہ اِس عہد کے عینی شاہد نہیں تھے لیکن اُنھوں نے ایسا نہیں کیا۔ وہ بس شاعرانہ رو میں لکھتے چلے گئے جس کی وجہ سے بعض بے بنیاد اور غلط معلومات کا اندراج بھی ہوا ہے۔

مصنف نے مجید امجد کے تذکرے کے دوران کئی جگہوں پر ذاتی حالات و واقعات کو بھی طُول دیا ہے۔ جن کا مجید امجد سے براہِ راست تعلق کم ہی بنتا ہے۔ بقول رفاقت علی شاہد:

''مجید امجد کی یادیں تازہ کرتے کرتے جملہ معترضہ کے طور پر کئی مقامات میں دیگر شعراء و ادباء کے سلسلے میں بھی ناصر شہزاد اپنی یادیں تازہ کرتے چلے گئے ہیں۔ یوں یہ کتاب صرف مجید امجد کی داستانِ حیات سے متعلق نہیں رہی بلکہ اس سے بڑھ کر ناصر شہزاد کی مجموعی یادداشتوں کا رُوپ اختیار کر گئی ہے۔''(۴۴)

کتاب میں کوئی تحقیقی طریقہ کار اختیار نہیں کیا گیا۔ اشاریے و حواشی کی کمی کا احساس بھی شدت سے ہوتا ہے۔ ناصر شہزاد کا مزاج مجموعی طور پر تحقیقی ہر گز نہیں تھا۔ حالاں کہ سوانحی مواد کی پیش کش میں اس کی گنجائش نہیں ہوتی، بہر حال ناصر شہزاد نے کتاب کے آخر میں خود اقرار کیا ہے کہ وہ محقق یا نقاد نہیں۔ اُنھوں نے مجید امجد سے متعلق سب کچھ اپنی ارادت اور پوری ذمہ داری سے لکھا ہے(۴۵) اور مزید برآں یہ اعتراف بھی کیا ہے:

''میں تاج سعید سے بہت شرمندہ ہوں کہ میں نے ان کے بلاوے پر کوئی بڑھاوا نہ دیا۔ میں مجید امجد کے معاملہ میں قطعی خاموش ہو گیا۔ پھر مجھے یہ سوچ بھی دہلاتی اور ڈراتی تھی کہ اگر میں مجید امجد کے بارے میں وہ سب باتیں لکھ دوں گا جو آخری عمر میں ان کے سامنے رہیں تو بہت سارے دوست مجھ سے ناراض ہو جائیں گے۔ کیوں کہ اس وقت جذبات میں جو ہیجان تھا۔ اب وہ جذبات کی پہچان نہیں رہا۔''(۴۶)

درج بالا بیان غیر ذمہ دارانہ ہے۔ اگر ایسا کچھ تھا تو بطور سچا تخلیق کار اِن حقائق کو سامنے لانا ان کی ذمہ داری بنتی تھی تاکہ مجید امجد کی وفات سے لے کر آخری رُسومات تک اہلیانِ ساہیوال کی طرف سے جو بے اعتنائی برتی گئی۔ اس کا پردہ چاک ہو جاتا۔ اس لیے سب کچھ بلا خوف و خطر بیان ہونا چاہیے تھا۔ کتاب میں خیال و اسلوب کا جائزہ زمانی ترتیب سے نہیں لیا گیا جس کی وجہ سے تمام واقعات گڈ مڈ ہو گئے ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر اسلم ضیاء نے ایک رائے دی ہے، لکھتے ہیں:

''اگر کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کر لیتے تو بہتر ہوتا، پہلے حصے میں سوانحی حالات و واقعات کا بیان اور دُوسرے حصے میں کلام پر تبصرہ۔اسی طرح بلحاظ مضمون، نظموں کی درجہ بندی کی جاسکتی تھی۔''(۴۷)

ڈاکٹر اسلم ضیاء کی بات درست ہے اور یہ احسن صورت ہو سکتی تھی لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ ناصر شہزاد کا مزاج اس تحقیقی ترتیب اور باریک بینی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا اور اُنھوں نے کتاب جس خیال اور مقصد کے تحت لکھی اس میں ایسا کرنا مشکل بھی تھا، کیوں کہ سوانحی واقعات کے ساتھ نظموں کے پس منظر، مشاعروں اور ان میں پڑھے جانے والے کلام کا براہِ راست تعلق نکلتا جاتا ہے اور وہ اس کو ساتھ بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔اگر وہ خود کو کسی ترتیب میں قید کرتے تو شاید یہ کتاب کبھی نہ لکھ پاتے۔

جزوی خامیوں اور بے ترتیبوں سے قطع نظر اس کتاب کو مجید امجد شناسی میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔کیوں کہ مجید امجد کم گو اور تنہائی پسند انسان تھے۔اپنی ذات سے متعلق سوالات سے عمر بھر گریزاں رہے۔ اس لیے مجید امجد کی ذاتی زندگی سے متعلق معلومات ایک آدھ سوانحی خاکے، انٹرویو اور چند سوانحی مضامین پر مشتمل تھیں جب کہ ان پر لکھی گئی کتابوں میں بھی ان کی سوانح و شخصیت کے بارے میں جزوی تذکرے دیے گئے ہیں۔اس لیے سوانح و شخصیت کے بارے میں جو تشنگی تھی، اس کتاب کی بدولت وہ حتّی المقدور دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مجید امجد کی سوانح و شخصیت کی روشنی میں ان کی فکر و فن کو سمجھنے میں جو پردے حائل تھے، وہ ہٹتے دکھائی دیتے ہیں۔اس کتاب میں شامل معلومات، ان کے سوانحی خاکے، انٹرویو اور ان پر لکھے گئے سوانحی وتاثراتی مضامین سے کہیں زیادہ ہے۔ کتاب پڑھتے وقت مجید امجد کی ساری زندگی کے مناظر فلم کی طرح نظر کے سامنے گھوم جاتے ہیں۔ایک واقعے سے دوسرا واقعہ جڑتا جاتا ہے۔ماضی کے جھروکوں سے ایک ایک کر کے تصویریں زندہ ہوتی جاتی ہیں۔اس حوالے سے ڈاکٹر انور سدید کا کہنا ہے:

''مجید امجد کی دریافت میں ناصر شہزاد کی کتاب انسانی کاوش نہیں بلکہ یہ بھی ان پر شعر کی طرح افلاک سے اُتری ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ناصر شہزاد نے اپنی لوحِ خیال پر کیسے کیسے

واقعات رقم کر رکھے تھے۔ایسی کتابیں توفیق الٰہی اور ذاتی کشادہ نظری کے بغیر ضبطِ تحریر میں نہیں لائی جا سکتیں۔''(۴۸)

ساڑھے تین سو صفحات کی اِس کتاب میں مجید امجد کی ذاتی زندگی کے بارے میں کئی چونکا دینے والے انکشافات ہیں اور کئی مشاہیر کے چہروں سے پردے اس طرح اٹھتے ہیں کہ دیکھنے والوں کو حیرت بھی ہوتی ہے اور صدمہ بھی۔یوں اس کتاب کو اُس عہد کے دبستانِ ساہیوال کی ادبی تاریخ بھی کہا جا سکتا ہے۔اس عہد کے بارے میں درج واقعات حقیقت پر مبنی معلوم ہوتے ہیں۔حمید اختر اپنے درج ذیل بیان میں ان واقعات کی تصدیق کرتے نظر آتے ہیں، لکھتے ہیں:

''ناصر شہزاد کے مجید امجد کے قُرب حاصل کرنے سے برسوں قبل قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ۱۹۴۸ء کے اوائل میں ہم نے بھی اپنے کئی ماہ کے قیام منٹگمری کے دوران مجید امجد کے ساتھ بہت سا وقت گزارا ہے۔ منیر نیازی اور ہمارا روزانہ اس کے گھر کا ایک پھیرا ضرور ہوتا تھا، کرائے کا وہ مکان جس میں وہ مقیم تھا۔اس کی ڈیوڑھی، ہمیشہ اس کے ساتھ رہنے والی اس کی سائیکل، محکمہ خوراک کا وہ دفتر جس کی ملازمت کے سلسلے میں وہ اپنے آبائی شہر جھنگ کو چھوڑ کر یہاں مقیم تھا،اب بھی ہماری نظروں کے سامنے ہے اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تقریباً ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل اس کتاب میں ناصر شہزاد نے اس بڑے شاعر کی جو تصویر پینٹ کی ہے وہ حقیقت سے بہت قریب ہے۔''(۴۹)

''کون دیس گئیو'' تحقیقی کم اور سوانحی، تنقیدی اور تاثراتی زیادہ ہے۔دورانِ کتاب مجید امجد کی نگارشات اور نظموں کے پس منظر کے بیاں والا حصہ بہت اہمیت کا حامل ہے جو مجید امجد کے کلام کی تفہیم میں کافی حد تک مددگار ثابت ہوا ہے۔ناصر شہزاد نے مجید امجد کی شاعری کو ان کی زندگی میں جس طرح حل کر کے پیش کیا ہے اور جس طرح ان کی نظموں، متفرق اشعار اور غزلوں پر اظہار خیال کیا ہے۔اسے ڈاکٹر شمس الرحمن فاروقی نے ''سچی تخلیقی تنقید'' قرار دیا ہے۔(۵۰) ڈاکٹر اسلم ضیاء نے بھی کتاب کے اس حصے کو اہم قرار دیا ہے۔ان کے خیال میں اس سے ''بعض نظموں کے پس منظر کے بارے میں آگاہی ملتی ہے۔گویا تفہیم کلام کی ایک راہ

نکلتی ہے۔ کتاب کا یہی پہلو نہایت اہم ہے جو اس کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتا ہے۔''(۵۱) حمید اختر نے بھی مجید امجد کی تخلیقات کے پس منظر کے بیان کو کتاب کی سب سی بڑی خوبی قرار دیا ہے، لکھتے ہیں:

> ''کون دیس گیئو'' کی سب سے بڑی خوبی ہمارے نزدیک یہ ہے کہ اس میں مجید امجد جیسے عہد ساز شاعر کی بیشتر تخلیقات کے پس منظر اور جن حالات میں یہ نظمیں اور غزلیں کہی گئیں، ان کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔''(۵۲)

درج بالا آراء اور حوالوں کی روشنی میں ''کون دیس گئیو'' کو اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ کہا جا سکتا ہے۔ ناصر شہزاد نے جس چشمہ فیض سے غسل آفتابی کیا اسے زندگی بھر نہ صرف یاد رکھا بلکہ اس کتاب کی وساطت سے ان کے چہرے سے گم نامی کی گرد ہٹاتے ہوئے اپنی بے لوث محبت اور عقیدت کا حق ادا کر دیا۔ ڈاکٹر شمس الرحمن فاروقی نے اِس گراں قدر تخلیق پر ناصر شہزاد کو درج ذیل تحسینی کلمات سے نوازا ہے:

> ''میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ مجید امجد کے غالب کے لیے آپ حالی ہیں لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ جب تک مجید امجد کا نام رہے گا۔ آپ کی کتاب بھی پڑھی جائے گی۔''(۵۳)

ڈاکٹر انور سدید اس توصیف میں حد سے گزر گئے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''خوشی کی بات یہ ہے کہ ناصر شہزاد نے اس نسبت کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ اپنی زندگی کے آخری دور میں ''کون دیس گئیو''، جیسی کتاب بھی پیش کر دی جو مجید امجد کی حیات اور شعری کائنات کی ویسی ہی دستاویز ہے جیسی مولانا الطاف حسین حالی کی ''یادگارِ غالب۔'' اس کتاب کو پڑھ کر مجید امجد ایک نئے روپ میں سامنے آتا ہے اور اس کی نظم نگاری کا پس منظر روشن ہو جاتا ہے۔''(۵۴)

جہاں تک مجید امجد کو ایک نئے روپ میں پیش کرنے کی بات ہے، یہ بالکل درست ہے کیوں کہ اُنھوں نے مجید امجد کی درویشی، استغنا اور غنی مزاج کا نقش اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ ایک عظیم شاعر ہی نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں ایک عظیم انسان بھی نظر آتا ہے، یعنی انسان دوستی اس کی فطرت کا جزوِ اعظم ہے جو بے ساختہ ان کی نظموں کے باطن میں بھی اُتر آتا ہے لیکن الطاف حسین حالی کی ''یادگارِ غالب'' سے موازنہ مبالغہ

آمیزی کو جنم دیتا ہے۔ڈاکٹر شمس الرحمن فاروقی نے اپنے درج بالا بیان میں جس موازنے سے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا ہے۔ڈاکٹر انور سدید نے اسے بلا خوف و خطر بیان کر دیا ہے۔اِس بیان کے حوالے سے اُنھوں نے عجلت سے کام لیا ہے کیوں کہ مولانا الطاف حسین حالی کے سامنے مرزا غالب کی ساری زندگی تھی۔ جس کی روشنی میں اُنھوں نے ''یادگارِ غالب'' لکھی۔اس لیے وہ ایک مکمل کتاب ہے۔جب کہ ناصر شہزاد نے مجید امجد کے ساتھ محض اٹھارہ بیس برس گزارے اور وہ مجید امجد کے ابتدائی دور اور قیام جھنگ کے زمانے سے قطعی ناآشنا ہیں۔اس دور کی بابت کتاب میں بہت کم معلومات میسر ہیں اور جو میسر ہیں وہ بھی جزوی،اُدھوری اور مشکوک ہیں۔اس لیے ''کون دیس گئیو'' کا ''یادگارِ غالب'' سے موازنہ نہیں بنتا،البتہ مجید امجد کے بارے میں معلومات کے وفور، ان کی نگارشات کے پس منظر کے بیان، ان کی سوانح و شخصیت کے اہم پہلوؤں سے آشنائی اور ساہیوال کی دو دہائیوں پر مشتمل ادبی محافل کے تذکرے کی بدولت اسے مجید امجد شناسی اور دبستانِ ساہیوال کی ادبی تاریخ میں سنگِ میل قرار دیا جا سکتا ہے۔

حوالہ جات و حواشی:

۱۔ ناصر شہزاد، کون دیس گئیو،(لاہور:الحمد پبلی کیشنز،۲۰۰۵ء)،ص۸۔

۲۔ ناصر شہزاد،''میری ذات،بساط اور شعری کائنات''،مشمولہ:استعارہ،شمارہ ۲۲۔۲۳،(جنوری تا جون ۲۰۰۶ء)، ص۲۰۸۔

۳۔ ناصر شہزاد،کون دیس گئیو،ص۳۲۷۔

۴۔ ایضاً،ص۱۱۵۔

۵۔ ایضاً،ص۵۶۔

۶۔ ایضاً،ص۵۷۔

۷۔ محمد اسلم ضیاء،جہانِ مجید امجد،(لاہور:الوقار پبلی کیشنز،۲۰۱۴ء)،ص۵۵۔

۸۔ نوازش علی،ڈاکٹر،مجید امجد تحقیقی و تنقیدی مطالعہ،(لاہور:اُردو اکیڈمی،پاکستان،۲۰۱۴ء)،ص۹۱۔

۹۔ ناصر شہزاد،کون دیس گئیو،ص۸۱۔

۱۰۔ سید جعفر شیرازی، ''مجید امجد اور میں (داستانِ رفاقت)''، مشمولہ: سہ ماہی القلم، مرتبہ: حکمت ادیب، (۱۹۹۴ء)، ص۲۹۔

۱۱۔ محمد امین، ڈاکٹر، ''میں عمر اپنے لیے بھی کچھ بچا رکھتا''، مشمولہ: سہ ماہی القلم، مرتبہ: حکمت ادیب، (۱۹۹۴ء)، ص۶۳۔

۱۲۔ ناصر شہزاد، کون دیس گئیو، ص۲۹۔

۱۳۔ خورشید رضوی، ڈاکٹر، ''میں نے اس کو دیکھا ہی''، مشمولہ: سہ ماہی القلم، مرتبہ: حکمت ادیب، (۱۹۹۴ء)، ص۲۵۔

۱۴۔ نوازش علی، ڈاکٹر، مجید امجد، تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، ص۱۸۶۔

۱۵۔ مجید امجد، کلیاتِ مجید امجد (طبع نو)، مرتب: خواجہ محمد زکریا، (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، مارچ ۲۰۱۰ء)، ص۸۸۔

۱۶۔ ناصر شہزاد، کون دیس گئیو، ص۳۱۔

۱۷۔ ناصر عباس نیرّ، ڈاکٹر، مجید امجد۔ شخصیت اور فن (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۸ء)، ص۳۲۔

۱۸۔ سید جعفر شیرازی، ''مجید امجد اور میں (داستانِ رفاقت)''، مشمولہ: سہ ماہی القلم، ص۹:۳۷۔

۱۹۔ ناصر شہزاد، کون دیس گئیو، ص۳۲۔

۲۰۔ مجید امجد، کلیاتِ مجید امجد (طبع نو)، (مرتب) خواجہ محمد زکریا، ص۵۹۔

۲۱۔ مجید امجد، ''کچھ تخت سنگھ کے بارے میں''، مشمولہ: سہ ماہی القلم، مرتبہ حکمت ادیب، (۱۹۹۴ء)، ص۶۳۳۔

۲۲۔ سید عامر سہیل، ڈاکٹر، مجید امجد۔ نقشِ گرِ ناتمام، (لاہور: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، ۲۰۰۸ء)، ص۴۳۱۔

۲۳۔ مجید امجد، ''کچھ تخت سنگھ کے بارے میں''، مشمولہ: سہ ماہی القلم، ص۶۳۳۔

۲۴۔ محمد اسلم ضیاء، ڈاکٹر، ''مجید امجد اور پروفیسر تقی الدین انجم''، (ایک انٹرویو)، حواشی و تعلیقات: ڈاکٹر محمد اسلم ضیا، مشمولہ: صحیفہ، (جولائی تا ستمبر ۲۰۰۰ء)، ص۶۸:۴۷۔

۲۵۔ نوازش علی، ڈاکٹر، مجید امجد۔ تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، ص۲۲۵۔

۲۶۔ ناصر شہزاد، کون دیس گئیو، ص۳۴۔

۲۷۔ نوازش علی، ڈاکٹر، مجید امجد۔ تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، ص۲۲۵۔

۲۸۔ ایضاً، ص۲۲۷۔

۲۹۔ ناصر شہزاد، کون دیس گئیو، ص۱۹۵۔

۳۰۔ محمد اسلم ضیا، ڈاکٹر، جہانِ مجید امجد، ص۶۱۔

۳۱۔ ایضاً، ص۶۲۔

۳۲۔ ایضاً، ص۶۲۔

۳۳۔ ناصر شہزاد، کون دیس گئیو، ص۲۱۲۔

۳۴۔ انور سدید، ''خط بنام اظہر جاوید (مدیر)''، مشمولہ: ماہنامہ تخلیق، (جون ۲۰۰۷ء)، ص۱۶۰۔

۳۵۔ اظہار الحق، ''شعاعوں کے چیتھڑے اوڑھے''، مشمولہ: ماہنامہ تخلیق، (فروری ۲۰۰۶ء)، ص۱۲۳۔

۳۶۔ ناصر شہزاد، کون دیس گئیو، (بیک فلیپ)، حسن عابدی۔

۳۷۔ ناصر شہزاد، کون دیس گئیو، ص۸۔

۳۸۔ ایضاً، ص۲۸۸۔

۳۹۔ شمس الرحمن فاروقی، ''خط بنام ناصر شہزاد''، مشمولہ: تخلیق، (اپریل ۲۰۰۷ء)، ص۱۵۸۔

۴۰۔ نوازش علی، ڈاکٹر، مجید امجد۔ تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، ص۲۵۔

۴۱۔ ناصر شہزاد، کون دیس گئیو، ص۱۵۸۔

۴۲۔ ایضاً، ص۳۶۶۔

۴۳۔ محمد اسلم ضیا، ڈاکٹر، جہان مجید امجد، ص۸۴۔

۴۴۔ رفاقت علی شاہد، ''کون دیس گئیو (مجید امجد کی حیات اور شعری کائنات''، (تبصرہ) کون دیس گئیو از ناصر شہزاد، مشمولہ: ماہنامہ تخلیق، (اگست ۲۰۰۸ء)، ص۱۲۵۔

۴۵۔ ناصر شہزاد، کون دیس گئیو، ص۳۲۷۔

۴۶۔ ایضاً۔

۴۷۔ محمد اسلم ضیاء، ڈاکٹر، جہان مجید امجد، ص۸۴۔

۴۸۔ انور سدید، ''خط بنام اظہر جاوید (مدیر)''، مشمولہ: ماہنامہ تخلیق، (جون ۲۰۰۷ء)، ص۱۶۰۔

۴۹۔ حمید اختر، ''تبصرہ کون دیس گئیو''، ص۱۰۔

۵۰۔ شمس الرحمن فاروقی،خط بنام ناصر شہزاد،ص۱۵۸۔

۵۱۔ محمد اسلم ضیاء،ڈاکٹر، جہانِ مجید امجد،ص۴۴۔

۵۲۔ حمید اختر،''تبصرہ کون دیس گئیو''،ص۱۰۔

۵۳۔ شمس الرحمن فاروقی،خط بنام ناصر شہزاد،ص۱۵۹۔

۵۴۔ انور سدید،ڈاکٹر،''بن باسی''،مشمولہ:ماہنامہ تخلیق،(فروری۲۰۰۸ء)،ص۸۲۔